حیات امام محمد تقی علیہ السلام

صفوۃ العلماء آقائے شریعت مولانا سید کلب عابد نقوی صاحب طاب ثراہ

مرکز دائرۂ عصمت وطہارت، ملجاء و ماوائے شرافت ونجابت، سلک عصمت کے درِ شاہوار، قلادۂ نوری محمدی کے بے بہا موتی، سلسلۂ زرّیں ذہبیہ کی کڑی، افلاک امامت کے فلک نہم، مظاہر انوار الٰہی کے تیسرے محمدؑ یعنی امام علیؑ رضا کے لخت جگر، فاطمہ زہرؑا کے نور نظر، محمدؐ وعلیؑ کے خنکیٔ بصر امام محمد تقی صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ وعلیٰ آبائہ الکرام المعصومین وابنائہ الاخیار المنتجبین کی مختصر زندگی کے حالات مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہوں تا کہ ارباب ایمان زمانے کی سختیوں، حوادث روزگار کے مقابلے میں موافق ونا موافق حالات میں امامؑ کے اُسوۂ حسنہ کو اپنے لئے سرمایۂ اتباع، آپ کے نقش قدم کو عقیدت کی سجدہ گاہ، خاک قدم کو سرمۂ چشم وبصیرت بنا سکیں۔

ہمارے یہ امام معصومؑ پندرھویں یا اُنیسویں رمضان یا دہم ماہ رجب کو (باختلاف روایت) زینت افزائے منصۂ شہود ہوئے۔ آپ کی ولادت کے وقت آپ کے پدر بزرگوار کا سنِ شریف ۴۰ یا ۴۲ سال کا تھا۔ اب تک کوئی اولاد نہ ہوئی تھی، لہٰذا حرف گیروں اور نکتہ چینیوں کو، جن میں آپ کے بعض قرابت دار بھی شامل تھے، موقع ملا کہ معاذ اللہ امام محمد تقیؑ امام رضائے غریب کی صلبی اولاد نہیں ہیں۔ بلکہ دوسرے کے بچے کو اپنی طرف منسوب کرلیا ہے تا کہ دوسرے اعزہ حقِ وراثت سے محروم ہوجائیں۔ یہ الزام تھا جس کے جد امجد کا یہ قول تھا: اری میراثی غصبا۔ (میں اپنی میراث کو لٹتے ہوئے دیکھتا ہوں۔) وہ مظلوم جن کے حقوق پر دوسروں نے ڈاکے ڈالے اور اس نے صبر کیا۔ آج اس پر معاذ اللہ دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا الزام لگایا جارہا ہے اور اپنے اس دعوے پر اتنی شدت سے اصرار کہ ایک مرتبہ جب کہ امام رضاؑ مامون کے پاس تھے، امام نہم علیہ السلام کا سنِ مبارک تقریباً پونے دو برس کا تھا، بعض لوگوں نے آپ کو مسجد الحرام میں بعض قیافہ شناسوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ بتاؤ یہ کس کے فرزند ہیں؟ جمال جہاں آرائے امامت پر نگاہ پڑنا تھی کہ تمام قیافہ شناس سجدہ میں جھک گئے اور سب نے بہ قسم کہا:

واللہ النسب الذکی والحسب المھذب الطاھر المھدی واللہ ما یرد وھذا الافی الاصلاب والارحام الطاھرہ واللہ ما ھولا من ذریۃ محمد رسول اللہ وذریۃ علی امیر المومنین۔

(خدا کی قسم یہ صاحبزادے طاہر ومطہر اور بلند منزلت حسب ونسب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ سوائے ذریت طاہرہ رسالت مآبؐ اور امیر المومنینؑ کے ہو ہی نہیں سکتے۔)

جب ان کے فیصلہ کو سن لیا تو اس پونے دو برس کے سن

والے بچے نے، جب سوائے اشاروں کنایوں کے دوسرے بچے صاف بول بھی نہیں سکتے، فصیح و بلیغ خطبہ کہنا شروع کر دیا۔ حمد و ثناء الٰہی کے بعد فرمایا کہ اے لوگو! میں محمدؑ، فرزند ہوں علیؑ ابن موسیٰؑ الرضا کا، جو فرزند تھے موسیٰؑ کاظم کے، یہاں تک سلسلہ نسب رسالت مآبؐ تک منتہی کرنے کے بعد فرمایا انتہائی افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ میرے حسب و نسب میں شک کرتے ہوئے مجھے قیافہ شناسوں کے روبرو پیش کیا جاتا ہے!! خدا کی قسم، میں وہ ہوں جو خود تمام لوگوں کے آباواجداد کے انساب سے واقف ہوں۔ ان کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہوں۔ جس کو معلوم ہے کہ لوگ کل کیا کرنے والے ہیں؟ جن کو خداوند عالم نے خلقتِ عالم سے قبل علوم کا مالک و وارث بنادیا ہے۔ پھر اپنے کچھ فضائل و مناقب بیان کرنے کے بعد آپ نے اپنا دست مبارک دہن اقدس پر رکھ کر ارشاد فرمایا: **یا محمد اصبحت کما صمت ابائک واصبر کما صبراولوالعزم من الرسل۔** (اے محمدؑ! بس خاموش ہو جاؤ جس طرح تمہارے آباواجداد خاموش رہے اور اولی العزم پیغمبروں کی طرح صبر کرو۔)

(منقول از دمعۃ الساکبہ)

امام نہم کی والدۂ ماجدہ کا اسم گرامی خیزران یا سبیکہ نوبیہ تھا جو ام المومنین ماریۂ قبطیہ رسولؐ کی محبوب زوجہ سے رشتۂ قرابت رکھتی تھیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ قدرت نے ہمارے اکثر ائمہ کے لئے کسی نہ کسی کنیز ہی کے بطن کو پسند فرمایا۔ شاید سبب یہ ہو کہ دنیا سب سے زیادہ باعث ذلت و حقارت غلامی و کنیزی ہی کو سمجھتی ہے، لیکن قدرت بتانا چاہتی ہو کہ میرے نزدیک تقرب و بلندی کا سبب امارت و دولت، حسب و نسب، ملک و ملت، آزادی و کنیزی سے عارضی و انتسابی اسباب نہیں بلکہ میں اس کو بلند کرتا ہوں جو نفس کے اعتبار سے بلند، جو ہر ذات کے اعتبار سے لائق پسند ہو۔ یا شاید اشارہ ہو کہ دربار اہلبیتؑ میں بلندی اسی وقت ملے گی جب حلقہ بگوش عبد و کنیز بن کر آئے۔ یہاں اپنے کو شہزادی ظاہر کرنے والوں کی رفعت نہیں۔ ہاں اگر شہزادی بھی عزت حاصل کرنا چاہے تو شہر بانو کی طرح لباس کنیزی پہن کر آئے۔ ورنہ اگر کنیز کے بطن سے ہونا کچھ قابل اعتراض ہو سکتا ہے تو سب سے پہلے جناب رسالت مآبؐ پر اعتراض آتا ہے جن کا سلسلہ بطن جناب ہاجرہؑ پر منتہی ہوتا ہے جو جناب سارہؑ کی کنیز تھیں۔

ہمارے امام نہمؑ ابھی بہت کم سن تھے یعنی چار پانچ برس کا سن تھا کہ مامون کی طرف سے امام رضاؑ کی طلبی ہوئی اور آپ کو مجبوراً جناب رسالت مآبؐ اور جناب فاطمہ زہراؑ کی قبر مطہرہ کی مجاورت ترک کر کے عازم سفر ہونا پڑا۔ امام نے اپنے تمام اہل بیت کو جمع کر کے فرمایا: ''آؤ، مجھ کو اس طرح رخصت کر لو جس طرح اس مسافر کو رخصت کیا جاتا ہے جس کی واپسی کی کوئی امید نہ ہو۔'' ظاہر ہے کہ جب امامؑ کو اپنی موت کا یقین تھا تو آپ کو اپنے اکلوتے فرزند امام محمد تقی علیہ السلام کو دشمنوں کے نرغے میں وطن میں چھوڑنے کا کتنا صدمہ ہوگا۔ مگر باپ نے بھی صبر کیا اور بیٹے نے بھی باوجود کم سنی صبر کے جوہر دکھائے۔ امام نہم ۵ یا ۷ برس ہی کے تھے (باختلاف روایات) کہ غریب الغرباء امامؑ شہید و مسموم نے وطن سے

دور ارض طوس میں شہادت پائی اور امام محمدؑ تقی منصب امامت مطلقہ و مسند نیابت رسولؐ اللہ پر فائز و متمکن ہوئے۔ ہمارا یہ امامؑ بھی اپنے جد امجد جناب رسالت مآبؐ کی طرح کم سنی ہی میں یتیم ہوگیا۔ آپ سے قبل ائمہ اہلبیتؑ میں کوئی امام ایسی کمسنی میں سایۂ پدری سے محروم نہ ہوا تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ اتنا کم سن بچہ کیوں کر اتنے عظیم الشان عہدے کے بار گراں کا متحمل ہوسکتا ہے۔ لیکن اس شبہ کو خود امام رضاؑ ہی دفع فرما گئے تھے۔ ابو قیا خدمت امامؑ میں حاضر ہوا اور عرض کی: مولا! ''اگر خدانخواستہ آپ دنیا میں نہ رہیں تو مسائل دین کس سے حاصل کریں۔؟'' آپ نے امام محمدؑ تقی کی طرف اشارہ کیا۔ ابو قیا نے کہا: ''مولا! ان کا سن تو ابھی تین ہی برس کا ہے۔'' امام نے کہا: ''تین برس کے سن میں منصب امامت پر تعجب لیکن عیسیٰؑ کے بارے میں کیا کہتے ہو جو گود میں کہتے ہیں: **انی عبداللہ اتانی الکتاب و جعلنی نبیا۔**'' حقیقت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک اگر منصب امامت اکتسابی چیز ہوتا تو سن وسال دیکھنے کی ضرورت تھی، مگر جب ہمارا اعتقاد ہے کہ اہلبیت ذات دیکھ کر خدا خود عنایت فرماتا ہے، تو تعجب کا محل کیا؟ جس طرح وہ ہر دنیا میں قدم رکھنے والے بچے کو کچھ علوم سیکھنے کی زحمت دیئے بغیر خود دے کر بھیجتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مچھلی کے بچے کو پیرنا کس نے سکھایا۔ اسی طرح علوم امامت بھی ان غواصان بحر علوم و معارف کو بغیر کسی دنیاوی اُستاد کے واسطے کے خود اُستاد ازل نے سکھا دیئے۔ دیکھ لیجئے ابوالبشر جناب آدمؑ پیدا ہوتے ہی علوم میں اتنے کامل کہ ملائکہ کو سرنگوں ہونا پڑا۔ جس طرح آدمؑ علوم میں ماہر پیدا ہوسکتے تھے اسی طرح خداوند عالم نسل آدمؑ میں بھی کچھ بچے اسی مرتبہ یا اس سے بلند مرتبہ کے پیدا کرسکتا ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لئے کم سنی میں مرتبۂ امامت پر فائز ہونا محل تعجب نہ ہونا چاہئے۔ باوجود صغرسن آپ کی نگاہ غیب بین کا یہ عالم تھا کہ محمد ابن طلحہ شافعی اپنی کتاب مطالب السؤل میں تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مامون الرشید شکار کے لئے گزر رہا تھا۔ راستہ میں کچھ بچے کھیل میں مصروف تھے امام محمدؑ تقی الگ کھڑے تھے۔ شاہی خدم و حشم کو دیکھ کر سب بچے تو بھاگ گئے۔ لیکن امامؑ اسی طرح کھڑے رہے۔ مامون نے پوچھا: ''سب لڑکے تو بھاگ گئے۔ آپ کیوں کھڑے رہے؟'' امامؑ نے انتہائی سکون ووقار سے جواب دیا کہ اے بادشاہ! نہ تو راستہ تنگ تھا کہ الگ ہٹ کر جگہ دیتا، نہ میں نے کوئی جرم کیا تھا کہ سزا کے خوف سے بھاگتا، نہ تجھ کو ایسا ظالم بادشاہ سمجھتا ہوں کہ بلاوجہ سبب تو مجھ کو اذیت دے گا۔ یہ فصیح وبلیغ جواب ایسے کم سن بچے کی زبان سے سُن کر مامون دنگ ہوگیا۔ پوچھا: ''آپ کا اسم گرامی؟'' کہا: ''محمدؐ'' پوچھا: ''والد ماجد کا نام؟'' جواب دیا: ''علیؑ رضا''۔ شاہی سواری آگے بڑھی۔ واپسی پھر اسی راستے سے ہوئی۔ امامؑ کو پھر اسی جگہ کھڑے ہوئے پایا۔ بادشاہ نے ہاتھ بڑھا کر پوچھا: ''میرے ہاتھ میں کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''**ان اللہ خلق بمشیة فی بحر قدرتة سمکا صغار اتصید ھا بزاة الملوک والخلفاء فیختبرون بھا سلالة اھل النبوة۔**'' (اے بادشاہ خدا کے بحر قدرت سے بادشاہ کے باز چھوٹی چھوٹی مچھلیاں شکار کرتے ہیں جن سے وہ بادشاہ سلالہ دودمان نبوتؐ وذریت طاہرہ

رسالتؐ کا امتحان لیتے ہیں۔)

اس واقعہ سے جہاں آپ کے علم لدنی الٰہی پر روشنی پڑتی ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ بڑوں کا کیا تذکرہ، خاندان رسالتؐ کے خرد سال بچے بھی شاہی خدم وحشم کو نگاہ میں نہ لاتے تھے اور دنیاوی شان وشوکت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہ تھے۔

جہاں تک تاریخی واقعات سے نتائج اخذ کرنے کا تعلق ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ مامون الرشید خود بھی علوم میں دستگاہ رکھتا تھا اور اہل علم کا قدردان بھی تھا۔ امام کے مراتب علمیہ اور سیاسی مصالح نے مجبور کیا کہ باپ کا قاتل فرزند کو پہلو نشین بنائے۔ امام رضاؑ کی شہادت کے بعد ملک کا ماحول کچھ ایسا ہوگیا کہ شاہی سیاست نے پھر پلٹا کھایا اور امام محمد تقی سے آپ کے پدر بزرگوار کی طرح دربار کو زینت بخشی گئی۔ یہاں تک سر دربار بادشاہ نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی ام الفضل کا عقد امامؑ سے کرنا چاہتا ہے۔ مخالفین خاندان رسالت امامؑ کے ظاہری اعزاز ہی سے جلے بیٹھے تھے۔ اب جو بادشاہ کے اس ارادے کی خبر ملی، پیروں سے زمین نکل گئی۔ مخالفت کے طوفان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بنی عباس نے متفقہ طور پر اس رشتہ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔ لیکن مامون کی رائے میں تزلزل نہ ہوا۔ آخر طے یہ ہوا کہ امامؑ کے علم وفضل وکمال کا امتحان لیا جائے۔ چنانچہ تمام مخالفین نے قاضی شہر یحییٰ بن اکثم کو انعام واکرام کا لالچ دے کر مقابلے کے لئے تیار کرلیا۔ دربار آراستہ ہوا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر متمکن ہوا۔ علم وفضل کا دعویٰ کرنے والوں سے دربار بھر گیا۔ ایک طرف کمسن شہزادہ، دوسری طرف پیر فرتوت یحییٰ ابن اکثم جس کو اپنی ہمہ دانی پر گھمنڈ۔ یحییٰ نے مامون سے پوچھا: ''اے بادشاہ! اجازت ہے کہ ان صاحبزادے سے کچھ پوچھوں؟'' مامون نے کہا: ''بجائے میرے خود ان سے اجازت حاصل کرو۔'' امامؑ نے اجازت دی۔ یحییٰ نے عرض کیا کہ اگر کوئی شخص حالتِ احرام میں کوئی شکار مارے تو اس کا کیا کفارہ؟ سوال سننا تھا کہ بحر علم اس طرح موج زن ہوا کہ یحییٰ کے غلط دعوؤں سے بنی کاغذ کی کشتی غرق ہوئی۔ ادھر علمی موجوں کے تھپیڑے تھے اور ادھر جبین عرقِ ندامت سے غرق۔ امامؑ نے اس سوال ہی میں اتنی شقوق پیدا کیں کہ قاضی صاحب سے کچھ پوچھتے نہ بنا۔ امامؑ نے فرمایا کہ تمہارا سوال بالکل مجمل ومہمل ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ جب اس نے شکار مارا ہے حِل میں تھا یا حرم میں، مسئلہ سے عالم تھا یا جاہل، عمداً مارا یا خطاءً، یہ شکار کرنے والا غلام تھا یا آزاد، بچہ تھا یا جوان، پہلی مرتبہ شکار کیا تھا یا دوبارہ، جس کا شکار کیا تھا وہ کوئی طائر تھا یا اور جانور، چھوٹا جانور تھا یا بڑا، دن میں شکار کیا یا رات میں، اپنے کئے پر نادم تھا یا مصر، اس کا احرام بقصد عمرہ تھا یا بہ ارادہ حج۔ مامون نے جب قاضی صاحب کو مبہوت دیکھا تو کہا: ''مولا! آپ ہی ہر ہر شق کا جواب دیجئے۔'' امامؑ نے بالتفصیل جوابات عنایت فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا: ''کیوں قاضی صاحب! میں بھی کچھ پوچھوں؟'' اب ان کا دماغ کچھ صحیح ہو چکا تھا۔ لہٰذا بہت تہذیب سے کہا: ''مولا! بسم اللہ۔ اگر مجھ کو معلوم ہوگا تو جواب دوں گا اور اگر نہ معلوم ہوگا تو آپ سے دریافت

کر کے اپنے علم میں اضافہ کروں گا۔'' امامؑ نے کہا: ''قاضی صاحب! یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عورت ایک شخص پر صبح کو حرام ہو، دوپہر کو حلال، شام کو پھر حرام۔ نصف شب کو حلال ہو، آدھی رات کے بعد پھر حرام ہوجائے، صبح کو پھر حلال ہو۔'' یحییٰ ابن اکثم سوال سُن کر ہکا بکا ہوگیا۔ کہا: ''لا واللہ مااھتدیٰ الی جواب ھذا السوال ولااعرف الوجد فیہ۔'' (خدا کی قسم میری سمجھ میں تو خاک نہیں آتا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے) امامؑ نے فرمایا: ''اچھا تو سنئے۔ صبح کو یہ عورت دوسرے کی کنیز تھی لہٰذا اس پر حرام، دوپہر کو جب اس نے اسے خرید لیا تو جائز ہوگئی۔ شام کو آزاد کردیا، حرام ہوگئی۔ نصف شب کو عقد کرلیا، جائز ہوگئی۔ رات کو ظہار کرلیا، حرام ہوگئی۔ پھر کفارہ دے دیا، جائز ہوگئی۔ طلاق دے دیا، حرام ہوگئی۔ رجوع کرلیا، جائز ہوگئی۔''

امامؑ کی اتنی کم سنی کے باوجود اس تبحر علمی اور خداداد قابلیت سے سارا دربار دنگ تھا۔ دوست دشمن سب متحیر اور انگشت بدنداں تھے۔

آخر مامون نے اپنی دختر ام الفضل کا بڑی دھوم دھام سے امامؑ کے ساتھ عقد کیا۔ ہزاروں اور لاکھوں روپیہ انعام واکرام میں تقسیم کیا۔ فقیر ومحتاج غنی ہوگئے۔ لیکن اس عقد کا انجام اچھا نہ ہوا۔ زروجواہر سے کھیل کھیل کر بڑی ہونے والی، خوشامدیوں اور جی حضوریوں کے جھرمٹ میں پرورش پانے والی ام الفضل جس کی نگاہ زروجواہر کے پہچاننے میں چاہے کتنی ہی مہارت رکھتی ہو، لیکن اس میں جوہر صفات کی پرکھ کہاں تھی؟ وہ تو تمام تر فضیلت اور شرافت مال ودولت پر منحصر سمجھتی تھی۔ بھلا! ایک فقیر بوریا نشین کی صحیح قدروعزت کیا پہچان سکتی تھی؟ امامؑ بھی جن کی نگاہ میں اپنے وقت کا سلطان السلاطین شہنشاہ اعظم مامون الرشید جس کے دبدبے سے بڑے بڑے سلاطین کانپتے تھے، باوجود اپنی جاہ وحشمت کے کوئی وقعت نہ رکھتا تھا، تو ام الفضل دختر شاہ ہونے کے سبب سے کیا سماتی۔ امامؑ کی نگاہ عصمت جوہر ذاتی کی متلاشی تھی۔ ام الفضل کی جیب لعل وجواہر سے تو پُر تھی لیکن جوہر صفات سے تہی دامن تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل نہ ملے۔ جب تک مامون زندہ رہا، باپ کو امامؑ کی طرف سے بھرتی رہی، مگر مامون الرشید نے بمصالح امامؑ کو کوئی اذیت نہیں پہنچائی۔ لیکن مامون کے مرنے کے بعد اسی ام الفضل کے بھائی جعفر اور معتصم کی سازش سے امام کی شہادت واقع ہوئی۔

مضمون طولانی ہوگیا ورنہ امام کے اخلاق پسندیدہ، حسن کردار، معجزات وکرامات وغیرہ پر کچھ اور روشنی ڈالتا۔ خاوند عالم اس وقت کے مسلمانوں کو جن کی نگاہ میں ہر عزت ورفعت مال ودولت کے زیر سایہ ہی حاصل ہوسکتی ہے امامؑ کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

وماتوفیقی الا باللہ